پریم چند کی اُردو کہانیوں کی پڑھت، سیاسی، سماجی، معاشی و دیہی تناظر میں

A reading of Premchand's Urdu stories in Political, Social, Economic and Rural Contexts

DOI: https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2024.08032243**

وقار حیدر

Waqar Haider
MPhil Scholar, Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan

Abstract:

Premchand is a famous writer of his time and era. Those who have used different dimensions in presenting their works, among which fiction and novels are considered in the forefront. Premchand's speeches on politics are also a basic and important reference, his sermon on the progressive movement is also a comprehensive and detailed document, but he earned his name in fiction writing and is known throughout the subcontinent for the same genre. are recognized. Basically, fiction writing is his real and best identity. It is only through his fiction writing that we can identify each of them as well as our own psychological study of Premchand, keeping in mind his creations. One can study the personality, habits and manners and their lifestyle without looking at the political life as well. In the following article, an attempt has been made to study the social, economic and psychological aspects of the legends written about their villages and shed light on their literary life. This article is also important because it contains important references for new writers.

Keywords:

Premchand, Anandi, Banaras, Ajaz Lal, Suzwatan, Patriotism, Presidential Sermon, Arya Samaj, Reform Movement, Dia. Narayan Niga

۳۱/ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس سے چھ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے گاؤں 'لمہی' میں دھنپت رائے (پریم چند) کا جنم ہوا۔ ان کے دو اور نام اِن کے والد عجائب لال نے 'منشی دھنپت رائے' جب کہ دوسرا نام اِن کے چچا نے 'منشی نواب رائے' رکھا۔ عجائب لال ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ اُن کے اکثر تبادلہ جات چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں ہوتے تھے

اور پریم چند اُن کے ساتھ ساتھ رہتے۔ انھیں چند کو دیہات کی ثقافت، ماحول، لوگوں کے رویے، اُن کی ذہنی سطح اور وہاں کے مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کا قریب سے موقع ملا، غریب کسانوں کی محنت، مکانوں کی خستہ حالی، طرزِ زندگی، کسانوں کی سچائی، دیہات میں غریب کسانوں کی غربت، اُن کی مجبوریاں، غریب کسانوں کا سود پر پیسے لینا جیسے موضوعات کو پریم چند نے اپنی کہانیوں میں برتا اور اُردو افسانہ کو بامِ دوام بخشا۔

اُردو افسانہ کی تخلیق میں ایک اہم کردار اِن کی دادی کی مدھر کہانیوں کا ہے۔ اسلوب میں پختگی اور روانی میں اِن کے ہم جماعت دوست (تمباکو فروش کا بیٹا) کا کلیدی کردار ہے جہاں چوری چھپے جا کر طلسم ہوش ربا کی داستان کو سنتے اور تمباکو نوشی کرتے۔ اس داستان نے دھنپت رائے کے ذہن اور تخلیقی اُفق میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا پڑھنے کے شوق کو مزید تقویت بخشی۔ پریم چند نے مولانا شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رُسوا، مولوی محمد علی ہر دوائی والے کے اُردو ناول جہاں کہیں ملتے پڑھنا شروع کر دیتے اور ختم کر کے ہی دم لیتے۔ پڑھنے کی لگن نے لڑکپن میں وہ تمام ذخیرہ پڑھوا دِیا جو اُس وقت اُردو ادب میں میسر تھا۔ قصہ، کہانی، ناول اور داستان پڑھنے کا شوق اُسی وقت جنم لے چکا تھا۔

پریم چند کی عمر ابھی مشکل سے پندرہ برس ہو گی کہ اِن کے والد نے موضع رام پور ضلع بستی میں اُن کی شادی کر دی آئے دِن سوتیلی والدہ سے لڑائی جھگڑے رہنے لگے۔ ان کے والد چند ماہ علیل رہنے کے بعد ۱۹۸۷ء کو چل بسے۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں سر پر آن پڑیں۔

۱۸۹۹ء میں انھیں ایک اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ پر عارضی نوکری مل گئی۔ وہ کچھ عرصہ الٰہ آباد میں رہے اور اِس کے بعد اِن کا تبادلہ ۱۹۰۵ء 'کانپور' ہو گیا۔ کانپور سے رسالہ 'زمانہ' نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم تھے۔ دیا نرائن نگم سے دوستی ہوئی۔ وہ اِنھی کی فرمائش پر اِن کے رسالہ 'زمانہ' کے لیے باقاعدہ طور پر مضمون اور افسانے لکھنے لگے۔ پریم چند کا کانپور میں آنے کا زمانہ دراصل وہ زمانہ تھا جب ایک طرف تو آریہ سماج کی اصلاحی تحریک اپنا سکہ جما رہی تھی تو دوسری جانب بال گنگا دھر تلک کی رہنمائی میں گرم دل کانگرس (۱۹۰۷ء کی سورت کانگرس میں تلک اپنے حامیوں کے ساتھ الگ ہو گئے تھے) یہ سیاسی سرگرمیاں نوجوانوں کو متاثر کر رہی تھیں اِس میں نواب رائے نے دونوں تحریکوں سے گہرا اثر قبول کیا۔

پورے ملک میں انگریزوں سے آزادی کی لہر پھوٹ رہی تھی۔ وطن پرستی اور آزادی کے جذبات کی موجیں طغیانی لانے لگیں۔ ہم وطنوں کے دِلوں میں آزادیِ وطن کی چنگاریاں پیدا کرنے لگے اِس حوالے سے اُنھوں نے اپنی کہانیاں لکھیں جس میں وطن سے محبت، غلامی سے بیزاری اپنا رنگ جمانے لگی اور یوں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' ۱۹۰۸ء نواب رائے کے نام سے کانپور سے شائع ہوا۔ اِنھوں نے وطن سے دوستی اور وطن کی محبت کے جذبات کو اسی مجموعہ میں شامل کیا۔ 'سوزِ وطن' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر

حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"(۱) انگریز حاکموں نے اُن کی کتاب کو پریم چند کے سامنے ہی یہ کہہ کر جلا دیا کہ اِس میں حکومت سے بغاوت کے لیے اُکسایا گیا ہے۔ دھنپت رائے کا ایک نام نواب رائے بھی ہے اِس لیے اب یہ اِن دونوں نام سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں انھیں دیا نرائن نگم نے مشورہ دِیا کہ آپ اپنا قلمی نام 'پریم چند' رکھ لیں جو اِنھیں پسند آیا۔

یوں تو نواب رائے کے نام سے ان کی دو طویل کہانیاں 'روٹھی رانی' اور 'کشنا' ۱۹۰۷ء کے اوائل میں شائع ہو چکی تھیں تاہم دسمبر ۱۹۱۰ء میں پریم چند کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' شائع ہوئی۔ اِس کہانی سے ایک ایسے باکمال ادیب اور تخلیق کار کا جنم ہوا جس نے ادب میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا اور شہرت حاصل کی۔ وہ پہلے وطن پرست قصوں، بندیلی راجپوتوں کی جرأت و دلیری کی نیم تاریخی کہانیوں میں کھوئے ہوئے تھے لیکن اب تخیل کی دُنیا سے آزاد ہو کر اپنے گرد و پیش کے سنگین حقائق سے آنکھیں ملانے لگے۔ ہر طرف معاشرے میں انھیں بے گناہ لوگ معصوم کسانوں کو لوٹنے والے، عورتوں کو مکر و فریب کا شکار بنانے والے، چھوت چھات کی گھناؤنی تفریق سے آلودہ مقدس انسانی رشتے صاف نظر آنے لگے۔ جہالت، توہم پرستی، رسم و رواج، ذات پات اور سماجی اونچ نیچ کے نتیجہ میں سماج میں جو جرائم پل رہے تھے۔ پریم چند اُن کے خلاف کھل کر احتجاج کرنے لگے۔ انھوں نے 'ہمدرد'، 'ادیب'، 'کہکشاں' اور صبح اُمید جیسے افسانے تخلیق کیے جس سے پریم چند کی زندگی اور بڑے افسانہ نگار کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اِس نام نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اصل نام کو بھول گئے۔

انگریزی عہد میں جب مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ، سول نافرمانی اور بائیکاٹ کا آغاز کیا تو پریم چند جو سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں اس وقت گورکھپور میں تھے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اِس حوالہ سے شیورانی دیوی بتاتی ہیں:

> "سن بیس کی بات ہے ترکِ موالات کا زمانہ تھا، گاندھی جی گورکھپور آئے آپ بیمار تھے پھر بھی میں، دونوں لڑکے، بابو جی میٹنگ میں گئے۔ مہاتما کی تقریر سن کر ہم دونوں بہت متاثر ہوئے، بیماری کی حالت تھی، بے بسی تھی، مگر تب ہی سرکاری نوکری کے خلاف ایک طرح کی اُداسی پیدا ہوئی...... مجھے کہتے ہیں کہ 'اگر تم رائے دیتیں تو میں سرکاری نوکری چھوڑ دیتا'، میں نے کہا 'کیا ہی اچھا ہو'...... اسی دِن استعفیٰ لکھ کر ہیڈ ماسٹر کو دیا۔ ہیڈ ماسٹر دیکھ کر گھبرا گیا اور بولا 'آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ۲۵۱ روپے پا رہے ہیں۔"(۲)

پریم چند ۱۵/ اپریل ۱۹۳۶ء کو ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی اور ان کا خطبۂ صدارت اُردو کی یادگار تحریروں میں سے ایک ہے اسی سال ہی اِن کی طبیعت بہت ناساز ہو گئی۔ ۲۵/ اگست ۱۹۳۶ء کو اِنھیں خون کی اُلٹی (قے) آئی ڈاکٹر کو بلوایا گیا تو اُس نے کہا پیٹ کی خرابی کی وجہ سے آئی ہے اس کے بعد اِن کی طبیعت مزید بگڑتی جا رہی تھی،

خون کی دوسری قے اِنھیں ۲۵/ جولائی رات اڑھائی بجے آئی۔ جس سے انھیں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اَب بچنے والے نہیں ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں 'منگل سوتر' لکھ رہے تھے۔ اپنے آخری ایام میں یہ لائنیں دہراتے تھے:

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دُنیا کی دُعا کر رہے ہیں اور اپنے جانے کی تیاری

دُنیا کی سب نعمتیں رہیں گی پر ہم نہیں رہیں گے

بالآخر ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اُردو کہانی کا تخلیق کار اِس دُنیا سے چل بسا۔

پریم چند نے دو سو پینتالیس کے قریب افسانے لکھے۔ اُن کی آزادی کی آواز صرف انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ہندوستانیوں کو نفسیاتی، معاشی اور سیاسی اُلجھنوں سے آزاد کرنے کے لیے تھی۔ ۱۹۱۳ء کے لگ بھگ انھوں نے ہندی میں کہانیاں لکھنی شروع کیں، کسی کہانی کا ترجمہ ہندی میں کرتے تو کسی کا اُردو میں۔

'سوزِ وطن' پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اِس میں کل پانچ افسانے شامل ہیں مگر 'یہی میرا وطن ہے' میں پریم چند نے حب وطنی اور وطن پرستی کا ایسا تصور پیش کیا ہے جو اُس دور کی قومی تحریکات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین وانی کے بقول:

"یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہر ادیب اور فن کار جس ماحول اور حالات میں پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے، اِس ماحول اور ان حالات کی پوری بوباس اِس کے رگ وریشے میں موجود رہتی ہے، اسے اپنے ماحول اور معاشرے کی صحت مند روایات سے بے حد پیار و محبت ہوتی ہے اور یہی جذباتی تعلق اِس کی تخلیقات میں بھی منعکس ہوتا رہتا ہے۔"(۳)

'بڑے گھر کی بیٹی' پریم چند کا ایک معروف افسانہ ہے۔ اِس کہانی میں مرکزی کردار ایک ایسی لڑکی کا ہے جو ریاست کے ضلع دار کے گھر میں چوتھے نمبر پر ہے۔ وہ بہت حسین اور سلیقہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھدار بھی ہے جس کا والد ایک ایسے گھر کی تلاش میں ہے جو اس کی حیثیت سے کم بھی نہ ہو اور حیثیت سے بڑا بھی نہ ہو۔ ایک گھر ملنے پر وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک ایسے گھر میں کر دیتا ہے جس کا لڑکا پڑھا لکھا تو ہے مگر وہ پرانی اقدار کا بہت بڑا مداح ہے۔ وہ خاندانوں کا ملاپ چاہتا ہے اور انھیں مشترکہ طور پر رہنے کا قائل بھی نظر آتا ہے مگر جب اِس کی اپنی شادی ہو جاتی ہے تو اِس کی بیوی کی اپنے دیور سے سالن میں گھی زیادہ ڈالنے پر لڑائی ہو جاتی ہے اور اِس بات کا علم جب اِس کے خاوند سری کنٹھ کو ہوتا ہے تو وہ اپنے والد سے علیحدہ گھر میں رہنے کی تکرار کرتا ہے اِس بات پر پورا گاؤں اُس لڑکے کا جائزہ لینے کے لیے مختلف بہانوں سے اِس کے گھر کے چکر لگاتے ہیں مگر جب سری کنٹھ اِس بات پر ڈٹ جاتا ہے کہ میں نے علیحدہ ہونا

ہے تو وہ گھر سے اپنا سامان اُٹھانے نکلتا ہے تو آنندی اُسے نہ صرف روکتی ہے بلکہ اپنے دیور کو بھی معاف کر دیتی ہے۔ اس بنا پر دونوں بھائیوں کی آپس میں دوبارہ صلح ہو جاتی ہے۔ محلے داروں اور علاقہ کے مکینوں نے جو گھر میں تماشے دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں وہ اِن کی صلح دیکھ کر تلملا کر رہ جاتے ہیں۔

اِس افسانے میں برصغیر میں موجود ایک ایسی عورت کو دکھایا گیا ہے جو اپنے گھر سے وراثت میں محبت، امن، اخوت، بھائی چارہ، معاملہ فہمی اور قربانی ساتھ لائی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے سماج کی عکاسی کرتی ہے جس میں عورت باہمت، حوصلہ مند اور محبت کی پاسداری کرے تو گھر کبھی نہیں ٹوٹتے اور اگر عورت چاہے تو وہ مشترکہ خاندانوں کو پل بھر میں توڑ سکتی ہے اگر عورت سلیقہ شعار اور بڑے گھر کی بیٹی ہو تو وہ عقل اپنے ساتھ لاتی ہے اور چھوٹے چھوٹے گھروں کو بڑے گھروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔

زمین داروں، مہاجنوں اور ساہوکاروں کا ظلم کسانوں پر بہت زیادہ تھا اُس وقت کی لکھی گئی کہانیوں میں سرفہرست کہانی 'بے غرض محسن' ہے۔ پس منظر میں عمومی طور پر ہر دیہات کی مختلف روایات، تہذیب، توہمات اور اُن کی ثقافت ہوتی ہے۔ کہانی کار اور کہانی اُس وقت تک قبول عام کا درجہ نہیں رکھ سکتے جب تک وہ دیہات کا پس منظر، ثقافت، روایات، تہذیب اور وہاں کے رسم و رواج سے بخوبی واقفیت حاصل نہیں کر لیتے۔ کردار، مکالمہ، پلاٹ، بیان، زبان اور اسلوب کے حوالہ سے پریم چند سرفہرست ہیں کہ جس کہانی کو جس علاقہ سے منسلک کر دیتے ہیں تو خود اُسی کے ہو جاتے ہیں۔ ان کی نئے کہانی اپنے معیارات پر پورا اُترتی ہے۔ یہ کہانی اِس لیے بھی لازوال ہے کہ پہلی بار ایک کسان افسانے کا ہیرو دکھائی دیتا ہے۔

نئے زرعی نظام کے پس منظر زمیندار اور کسان کے درمیان یہ تصادم کیسا حقیقت پسندانہ ہے۔ ہیرامن کو اگر اپنے اقتدار کا نشہ ہے تو تخت سنگھ کی عزتِ نفس اِس کی قوت بنی ہوئی ہے۔ پریم چند نے ایک سچے اور ترقی پسند فنکار کی حیثیت سے اِس نوزائیدہ زمیندار طبقہ کی نفسیات اور جارحانہ رویوں کی عکاسی کی ہے۔ پریم چند کے افسانہ 'صرف ایک آواز' دیہات میں موجود ایک شخص کی ترجمانی کر رہے ہیں وہ اپنے ملک میں موجود اچھوت لوگوں سے محبت، ہمدردی اور پیار کا درس دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> "صرف ایک آواز میں بھی اچھوتوں کے مسئلے پر گاؤں کے آئے ہوئے ایک ٹھاکر کی انسان دوست آواز سنائی دیتی ہے۔"(۴)

دیہات کے موضوعات، رسم و رواج، میلے، ٹھیلے اور انھی علاقوں میں پرورش پانے والے ایسے بیل بوٹے جو پروان چڑھ کر ایک تناور درخت بن جاتے ہیں اور ایسے رواج جو پورے علاقے یا گاؤں کے لیے ایک ہنسی اور خوشی کا باعث بنتے ہیں وہاں اِن میں ایسی ایسی رنجشیں بھی جنم لے لیتی ہیں جو آگے چل کر کسی ناحق کو محض اپنے انا گوٹھ، موضع، دیہات

یا علاقہ کی بے عزتی کا سبب پیدا کرنے کی وجہ سے خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ دیہاتی علاقوں میں پروان چڑھنے والے چھوٹے چھوٹے میلے، تہوار جن میں اُن علاقوں کے تہذیبی، روایتی، ثقافتی اور موسمی رنگ شامل ہوتے ہیں اُن کا حال پریم چند کے ہاں بکثرت ملتا ہے۔

افسانہ "اندھیرا" ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں ساٹھے اور پاٹھے دو ملحقہ موضع جات کے دو پہلوانوں کی کبڈی ہے جن میں ساٹھے کا پہلوان 'گوپال' اور پاٹھے کا پہلوان 'بلدیو' ہے۔ دونوں پہلوان اپنے اپنے علاقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ موضع ساٹھے کے لوگ دلیر، بہادر ہیں جن کی تاریخ فتوحات کی روایتوں سے بھری پڑی ہے جب کہ پاٹھے کے لوگ 'بلدیو' پہلوان کے ذریعے ساٹھے کے لوگوں کو زیر کرنے کے لیے اپنے پورے جوش و خروش میں نظر آتے ہیں پریم چند اپنے اس افسانہ میں پورے ہندوستانی میلے کا سماں باندھتے ہیں اقتباس دیکھیے:

> "ادھر اکھاڑے میں داؤ پیچ ہوتے رہے، بلدیو اُلجھتا رہا، گوپال پینترے بدلتا تھا۔ اُسے اپنی طاقت کا زعم تھا۔ اسے اپنے کرتب کا بھروسہ کچھ دیر تک اکھاڑے سے خم ٹھونکنے کی آوازیں آتی رہیں، تب یکا یک بہت سے آدمی خوشی سے نعرے مار مار کر اُچھلنے لگے۔ کپڑے، برتن، پیسے اور بتاسے لٹائے جانے لگے۔ کسی نے اپنا صافہ پھینکا، کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اُڑادی۔ ساٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے اور گوپال کو گود میں اُٹھالائے۔ بلدیو اور اِس کے رقیبوں نے گوپال کو لہو کی آنکھوں سے دیکھا اور دانت پیس کر رہ گئے۔"(۵)

'بانکا زمیندار' پریم چند کا ایک لازوال افسانہ ہے۔ ٹھاکر ریودمن سنگھ خود بھی باہمت، حوصلہ مند اور بہادر ہے اور ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا اور اُن کی قدر کرتا ہے۔ جب وہ پہلی مرتبہ گاؤں جاتا ہے تو کسانوں سے تین سال کا لگان پیشگی ادا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں کسانوں کو گاؤں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم بھی دیتا ہے، تاہم کسان تین سال کا لگان پیشگی ادا کرنے سے قاصر ہیں اور وہ مجبوراً گاؤں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ دوسری مرتبہ گاؤں کی ہریالی، شاندار فصل سونا اُگلتی ہوئی زمین کو جب دیکھتے ہیں تو اُسے ظالم زمیندار کی سابقہ باتیں بھول جاتی ہیں کہ جیسے تیسے ہو ازمیندار کو منالیں گے، اُس کی گالیوں کو دُعا تصور کرنے لگتے ہیں۔ گاؤں دوبارہ بسالیتے ہیں تو دوسری مرتبہ جب ٹھاکر ریودمن سنگھ کو اِس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ گاؤں میں دوبارہ ہریالی آگئی ہے، فصل تیار ہے اور سونا اُگل رہی ہے تو وہ سیر کے لیے گاؤں کا رُخ کرتا ہے۔ پورا گاؤں اُس کے استقبال کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو ٹھاکر ریودمن سنگھ 'لیمونڈ اور برف' کی فرمائش کرتے ہیں۔ سادہ دل اور بے حال کسان یہ فرمائش بھی پوری نہیں کر پاتے وہ دیسی لوگ شہروں کی باتیں کیا جانیں؟؟ دوسری بار پھر اُنھیں زمیندار فصل سے بے دخل کر دیتا ہے اور اُنھیں شام تک اُن کے گھروں سے نکلنے کا حکم

جاری کر دیتا ہے۔ شریف، بزدل اور ڈرپوک کسان پھر ہریالی فصل کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

تیسری بار بنجارے اِس ویران زمین کو آباد کرتے ہیں جو آہنی حوصلوں کے مالک، ہمت اور آبرو والے ہیں۔ ٹھاکر رپودمن سنگھ پھر اُن سے فصل کے بارے میں پوچھتے ہیں تو بنجاروں کا ایک بوڑھا ہر داس کہتا ہے بھگوان کی کرپا ہے، حضور کے قدموں سے سب چین ہے، آپ کا دِیا ہوا کھاتے ہیں تو اِس خوشامد پر ٹھاکر رپودمن سنگھ سیخ پا ہو جاتے ہیں اور اُنھیں بے آبرو کرتے ہیں۔ ہر داس کہتے ہیں کہ زمیندار کو ہم اپنا سر تو دے سکتے ہیں مگر آبرو نہیں۔ تو اُنھیں رات ورات نکل جانے کا فیصلہ بھی صادر کر دیا جاتا ہے کہ اِس سے قبل بھی میں ایسے کر چکا ہوں مگر وہ اِن سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور زمیندار کے سپاہیوں کو بھی مارتے ہیں۔

پریم چند اپنے اِس افسانے کے ذریعے ہندوستانی سماج میں ایک ایسا طبقہ کو اوپر لانا چاہتے ہیں جو اپنے حقوق کے لیے ظالمانہ طاقتوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہو۔ وہ مہربان، خوشامدی اور ڈرپوک کسان سے اُکتائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اِن کسانوں کی جگہ ایک حوصلہ مند، بہادر اور نڈر کسان لانا چاہتے ہیں جو اپنی محنت کرتے ہیں اور اُس کا ثمر بھی خود ہی کھاتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> ”چتوڑ والے تو سر کٹانے کے لیے آئے ہی ہیں مگر وہ راجپوت ہیں، تو پربھا کو لے کر ہی جائیں گے۔ بوڑھے راؤ صاحب کے بدن میں رعشہ آ گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ تلوار کھینچ کر، رانا وار کو بچا کر پربھا سے بولے راجکماری ہمارے ساتھ چلو گی؟ پربھا سر جھکائے ہوئے رانا کے سامنے آ کھڑی ہو گئی اور بولی ہاں چلو گی۔“(۶)

یہ ایک وہ فیصلہ ہے جب پربھا نے راجپوت کی عزت کو خاک میں ملا دیا اور ساتھ ہی اپنی محبت کی یلغار کو بھی توڑ دِیا اور اسے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دِیا مگر درحقیقت اِس کے پیچھے ایک خونریزی ہے جس کے لیے 'پربھا' راضی نہیں ہے وہ جنگ نہیں بلکہ امن چاہتی ہے۔

پریم چند ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنی کہانیوں میں کرداروں کی ظلم وزیادتی بھی دکھاتے ہیں اور اُس کے بعد اِن پر مرہم ایسے لگاتے ہیں کہ مظلوم کو بھی یہ داستان حقیقت نظر آتی ہے اور وہ کچھ کہے بنا خاموش ایک پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہتا ہے۔ دیہی معاشرے میں فکر و عمل اور خاندان کا مرکز و محور زمین ہے۔ اس دیہی معاشرے نے پنچایت کی ایک ایسی مستحکم روایت کو جنم دِیا ہے جس کا کوئی مستقل آئین، دفتر اور عملہ نہیں پھر بھی یہ روایت صدیوں سے قائم ہے۔ پریم چند کا افسانہ 'پنچایت' ایک نایاب افسانہ ہے جس میں دو دوستوں کی کہانی بیان کی گئی جن کا آپس میں رہنا، بیٹھنا ایک ہے۔ اُن کے کاروبار کی سانجھ بھی ایک ہی ہے۔ ان دونوں کے خیالات آپس میں ملتے ہیں۔ اِس لیے ان دونوں میں دوستی بہت ہے۔ انھوں نے اس افسانے کے ذریعے برصغیر میں دوستی کی ایک ایسی مثال روبرو کھڑی کی ہے جس میں ایک دوست

'جمن' کو لالچی دکھایا گیا ہے جو اپنی خالہ کی جائیداد مختلف حیلوں بہانوں سے ہتھیانے میں مگن نظر آتا ہے۔ جائیداد اپنے نام کرانے کے بعد اُسی خالہ کو تنگ کرتا ہے حتیٰ کہ کھانا دینے پر بھی مختلف باتیں سنائی جاتی ہیں جس سے وہ تنگ آجاتی ہے کہ میری ساری جائیداد لینے کے بعد تمہارا ایسا سلوک ہو گیا ہے جس کی مجھے بالکل توقع نہ تھی تو اِس میں 'جمن' بھی اپنی بیوی کو کچھ نہ کہنے پر مجبور دکھایا جاتا ہے اور خالہ پنچایت بلانے کا فیصلہ کرتی ہے اور پنچایت کا سرپنچ 'جمن' کا دوست 'الگو' منتخب ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں زمیندار کو لالچی دکھایا گیا ہے کہ اُس کے پاس چاہے جتنی بھی زمین ہو مگر وہ دوسرے کی زمین ہتھیانے کی لگن میں رہتا ہے اور اُسے سنہرے باغ دِکھا کر زمین ہتھیا لے جاتا ہے اور بعد میں معصوم اور نادار لوگوں کا کوئی پُرسان حال نہیں بنتا۔ جہاں کورٹ کچہری، عدالتوں میں فرضی ثبوتوں سے سیاہ، سفید کو ملایا جاتا ہے وہاں یہ فطری ماحول میں پروان چڑھنے والی 'پنچایت' فطری فیصلے کرتی ہے جس میں نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے اور نہ ہی گواہ پیش کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ سچے دِل اور ضمیر رکھنے والوں کی کہانی ہے آج کے لوگوں کی نہیں کہ جن کے دِل آج بھی زنگ آلود ہیں اور انھیں اِن فیصلوں کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنی مرضی کے فیصلے کرواتے ہیں۔

پریم چند نے 'سمجھو سیٹھ' کی نفسیات بیان کی ہے کہ جب کسی ایک شخص کو جو روپوں کا لالچی ہو وہ کسی کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال نہیں کرتا، یہ صورتِ حال اِس وقت پورے سماج میں رائج ہے۔ پریم چند ایک سماجی واقعیت نگار ہیں کہ جیسا سماج میں رویہ، دستور اور موقع محل ہے اور جو لوگوں کی نفسیات ہے وہ اپنے افسانوں میں ویسی ہی استعمال کرتے ہیں۔ 'شیخ جمن' اور 'الگو چودھری' میں جب پنچایت کا فیصلہ ہوتا ہے اور 'الگو چودھری' اپنی بیل کے پیسے 'سمجھو سیٹھ' سے لینے کے لیے آتا ہے اور بیل دم توڑ چکا ہوتا ہے اِس پر سمجھو سیٹھ اور اِس کی بیوی 'الگو چودھری' پر سیخ پا ہو جاتے ہیں بالآخر 'الگو چودھری' کو پنچایت کا ہی رُخ کرنا پڑتا ہے اور پنچایت میں سرپنچ 'شیخ جمن' نامزد کر دیا جاتا ہے جس میں 'الگو چودھری' کو اِس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اب ضرور میرے خلاف ہی فیصلہ سنائے گا مگر سرپنچ 'شیخ جمن' اپنا فیصلہ 'الگو چودھری' کے حق میں دیتے ہیں تو اِس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہی شخص جب ایک عام شخص بن کا فیصلہ سنتا ہے اور جب اُسی کو میزان یا عدل کی کرسی پر بٹھا دِیا جاتا ہے تو تب اُس کا رویہ، سماج اور دھرم کو مد نظر رکھنا ضروری بن جاتا ہے۔ 'پنچایت' میں پریم چند نے دیہات میں لوگوں کی سادہ دلی اور اُن کا بھگوان سے ڈرنا اور اپنی عاقبت اچھی ہونے کی آرزو رکھنا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں تشبیہات اور استعاروں کا استعمال بہت ملتا ہے گویا اُردو افسانہ نگاری کا فن یہی ہے کہ کہانی کار اپنی کہانی کو کیسے کیسے استعاروں سے نوازتا ہے کہ اُن میں کہانی کہیں بے ڈھنگ نظر نہ آئے اور اپنی اہمیت اور وقعت کو برقرار رکھے تاہم اِس کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی مد نظر رکھنا ہے کہ وہ بھی کہانی کے استعاروں اور تشبیہات سے پریشان نہ ہو جائے اور کہانی بد ذائقہ نہ ہو جائے یہ کہانی کی خوبی ہے اور کہانی کار کا کمال فن۔

'منتر' ایک ایسے ہی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جہاں سے اِس کی فطرت میں ماحول کا اثر بہت گہرا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانے میں انسان کے شعور اور لاشعور کو ایک ہی قالب میں ڈھال دیا ہے کہ سگمنڈ فرائیڈ جیسے مغربی نقاد نے نفسیات کے تین بنیادی اُصول شعور، تحت الشعور اور لاشعور کو ایک ہی افسانہ میں یکجا کر دیا ہے جسے ہم تحلیل نفسی کہتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے افسانہ 'منتر' میں ایک ایسا گروہ جو شہری زندگی اور اس کے ماحول کی پیداوار ہے جس نے اپنے آرام، سکون اور کام کے لیے وقت متعین کیا ہوا ڈاکٹر چڈھا کے روپ میں ہمیں ملتا ہے جبکہ اِس کے برعکس ایک غریب، ان پڑھ، دیہاتی اور بوڑھا شخص بھگت ہے۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> "بھگت سانپ کے کاٹے کا علاج جانتا ہے لیکن یہ علم و ہنر اُس کے حصولِ زر کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ خدمت خلق اور روحانی مسرت کا وسیلہ ہے۔"(۷)

ایک طبیب وہ ہے جس کے پاس مریض کو لے کر جاتا ہے مگر وہ اپنے کھیلنے کے وقت میں مریض کو چیک نہیں کرتا ایک وہ طبیب ہے جس کو سانپ کے ڈسنے کا علم ہوتا ہے تو اُس کی روح تڑپ جاتی ہے اور وہ بے چین ہو کر مریض کے پاس خود پہنچ جاتا ہے اور شفاء ملنے تک وہی کھڑا رہتا ہے۔ پریم چند نے ان دونوں صورت میں ایسی ایسی کمال فن کاری دکھائی ہے کہ جیسے کہا جاتا ہے دُنیا کا کوئی بھی شخص ناکارہ نہیں ہے بلکہ ہر کوئی اپنے اپنے فن کا ماہر ہے۔ دُنیا ایک ایسی گول مشین ہے جو گھومتی رہتی ہے اور زندگی میں ایک دوسرے کا سامنا ضروری بن جاتا ہے بعض امراض ایسے ہیں کہ آپ طبیب ہونے کے پیشہ سے منسلک ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتے، کوئی چارہ آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر چڈھا کا بیٹا 'کیلاش' جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے بہت سے لوگ چڈھا کے پاس آئے منتر پڑھے، پانی پھینکا مگر اِس کا علاج نہیں ہو پاتا مگر اُس کا علاج ایک ایسے بزرگ، ضعیف، غریب اور لاچار آدمی کے پاس ہے جن کا واحد سہارا اُس کا سات سالہ بیٹا ڈاکٹر چڈھا کے چیک نہ کرنے کی وجہ سے دُنیا جہان سے چلا گیا تاہم جب اُنھیں ایک شخص آ کر بتاتا ہے کہ ڈاکٹر چڈھا کے بیٹے کو کالے ناگ نے کاٹ لیا ہے تو وہ اپنی جائیداد بھی اُس شخص کو دینے کے لیے تیار ہیں جو اِن کے بیٹے کی زندگی بچا دے انسان کی ذہنی و جذباتی کشمکش، فرض اور انتقام کا تصادم ایک مکمل عکس کے ساتھ بھگت جیسے کردار کے ذریعے ہم تک پہنچا۔

پریم چند کے فن کا جائزہ اِس افسانہ میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے یہ وہی افسانہ ہے جب فنکار اپنے افسانے کا دوامِ عروج حاصل کرتا ہے۔ پریم چند کے افسانہ 'منتر' میں ان کا فن، نفسیات، ذہن اور عکاسی کا وہ کمال نظر آتا ہے کہ اِس سے قبل نہ تو کسی افسانہ نگار کے ہاں ملتا ہے اور نہ ہی اس عہد میں کسی اور افسانہ میں ملتا ہے۔

افسانہ 'پوس کی رات' میں پریم چند نے ایک ایسے ماحول کی عکاسی کی ہے جہاں انسان اور فطرت دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک غریب کسان اور اُس پر قرضوں کا بوجھ کہ وہ اپنی آبرو سے ڈرتے ہوئے اپنی

ضروریات کو بھی ایک طرف رکھ دیتا ہے جس سے فطرت کا وہ سامنا کرتا ہے مگر کسی ایسے شخص سے بے آبرو نہیں ہو سکتا جس کا وہ مقروض ہے۔ انسان کا ایک ایسا دوست 'جبرا' جو ہر مشکل وقت میں اپنے غریب مالک کے ساتھ رہتا ہے وہ پوہ گھر کی سردی بھی اپنے مالک کے ساتھ کھیت میں جا کر برداشت کرتا ہے نہ تو مالک کے سر پر کوئی سایہ ہے اور نہ ہی جانور کے سر پر مگر وہ پھر بھی مالک کے ساتھ کھیتوں میں چارا کھانے والے جانوروں کو بھگانے میں اپنا سینہ تان کر اُن کا مقابلہ کرتا ہے اور مالک کا وفادار ہے۔

کسان ہر حالت میں چاہے سخت گرمی ہو یا سخت سردی وہ فطرت کا مقابلہ تندہی سے کرتا ہے مگر کسان کے لیے کڑی آزمائش موسم سرما ہے۔ موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ سامان مہیا کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔ فطرت سے مقابلہ کرنے کے لیے کبھی تو اُس کی جیت ہوتی ہے تو کبھی اُس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ایک حقیقت پسندانہ تصویر کشی کا منظر ملاحظہ کیجئے:

> "پوس کی اندھیری رات پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانے گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا ہے، کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا جبرا پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کُوں کُوں کر رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ نیند آتی تھی۔"(۸)

فطرت کا اظہار، کڑاکے کی سردی سے عام انسان اور حیوان سب ہی کس قدر بے بس نظر آتے ہیں۔ فطرت کے اِس اظہار پر ایک بے بس دوسرے بے بس کا مذاق نہیں اُڑاتا بلکہ اُسے اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے۔ پریم چند نے جبرا اور ہلکو کے ذریعے کمزور انسان کے اتحاد کا کیسا منظر پیش کیا ہے جو ایک دوسرے سے طاقت پا کر بڑی طاقت بن سکتے ہیں اسی طرح کسان بھی چھوٹے چھوٹے سہاروں کی مدد سے قدرت کا مقابلہ کرتا ہے۔ ہلکو جب کتے کو اپنی گود میں اُٹھالیتا ہے تو اُس کے جسم سے بدبو نہیں بلکہ روح کی پاکیزگی ظاہر کرتا ہے اور جبرا کو بھی شاید یہی بہشت نظر آتی ہے کہ وہ اپنے مالک کی گود میں سکون محسوس کرتا ہے اور ہلکو اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ عظیم الشان صدیقی رقمطراز ہیں:

> "روح کی یہی پاکیزگی اور باطن کا نور انسان کو بے خوف بناتا ہے اور مخالف قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اُس پر زندگی کی راہیں روشن کرتا ہے۔ روح کے اِس عرفان نے ہلکو کے اندر بھی ایک نئے انسان کو جنم دِیا ہے تھا۔ اس انسان کو جو لوہے سے لوہے کو کاٹتا ہے۔ جس کے لیے اگر قدرت سب سے بڑا چیلنج ہے تو اُس کی ذہانت نے قدرت کے ایک روپ کو دوسرے روپ کے خلاف استعمال کرنے کا ہنر بھی سیکھ لیا ہے اور اِس میں وہ کامیاب

بھی ہوتا ہے۔"(۹)

ہلکو کی بیوی (منی) فصل میں اُٹھانے کے لیے آتی ہے تو فصل میں لگی آگ اُس کے دِل میں لگتی ہے جب وہ ہلکو کو اُٹھاتی ہے تو اُسے کے چہرے پر اُداسی چھا جاتی ہے۔ مہینوں کی مشقت، ایک ایک دِن کی مشقت، ایک ایک رات کا پہرہ جب کسان اپنی زمین تیار کرنے کے لیے ساری مصیبت سر پر جھیلتا ہے تو وہ قدرت کا نظارا ایسا ہے کہ اُس کی مہینوں کی مشقت، راتوں کے چہرے سارے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں جب قدرت ایک ہی رات میں اُس کی تیار فصل کو جلا کر مسمار کر دیتی ہے تو پریم چند کا فن 'ہلکو' یہ یہ جملہ کہلواتا ہے کہ "چلو اچھا ہوا جل جانے دے سارا کھیت۔ رات کو کم از کم کھیت میں پہرے داری تو نہیں کرنی پڑے گی۔" منی اِس وجہ سے پریشان ہے کہ فصل بھی جل گئی اور اب مال گجاری اور لگان جو زمیندار کو دینا ہے اور کہتی ہے "اب مجدوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔"

پریم چند کا افسانہ 'پوس کی رات' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں پریم چند کا فن اپنی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانہ میں فن، مقصد، تخیل، ماحول، فطرت کی آمیزش نے افسانہ کو شاہکار کر دیا۔

'بیاج' معاشرے کی ایک ایسی لعنت ہے جس سے ایک امیر سے امیر آدمی بھی ایک ایسی دلدل میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنا اُس کے لیے وبالِ جان ہے اور اگر اسی لعنت سے وابستہ ایک غریب کسان ہو تو وہ کتنا، لاچار، مجبور اور بے بس ہو جائے گا کہ اِس بیاج کو اُتارنے کے لیے اُسے آباد و اجداد مزدوریاں کرنے لگ جاتے ہیں مگر بیاج ہی کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ 'سوا سیر گیہوں' پریم چند کا ایک ایسا لازوال افسانہ ہے جس میں پریم چند نے ایک ایسی حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے جہاں احساس، محبت، دُکھ، درد کو مل کر بانٹنا نہیں ہے بلکہ ایک غریب آدمی کو اِتنا بے بس ولاچار کر دینا ہے بلکہ زمین بھی پناہ نہ دِے۔ شنکر ایک سیدھا سادہ غریب کسان ہے جسے سیدھا اپنے کام سے غرض ہے نہ تو کسی سے لینا نہ اور ہی دینا۔ بھگوان کے بھگت کے لیے گھر میں موجود اناج سے اُس کی خاطر تواضع اچھی نہ کر سکتا تھا۔ شنکر خود تو بھوکا رہ سکتا تھا مگر بھگوان کا بھگت اُس کے لیے بھگوان سے کم نہ تھا۔ اُس کی آؤ بھگت، مہمان داری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

سوا سیر گیہوں اُدھار لینے پر شنکر کو شاید اِس بات کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ اِس سوا سیر گیہوں کے لیے وہ اور اُس کی آنے والی نسلیں بھی وہاں مزدوری کریں گی تب بھی سوا سیر گیہوں کا بیاج ختم نہ ہو گا۔ بھگت کی خاطر داری تو خوب کی مگر اسی خاطر اور مہمان نوازی سے وہ خود اور آنے والی نسلیں پروہت جی کی غلام بن گئیں اور پروہت جی کے ہاں بیاج میں مزدوری کرنے لگیں۔

پریم چند کا افسانہ 'سوا سیر گیہوں' معاشرے کی ایک سچی کہانی ہے۔ پریم چند اپنے عہد اور زمانے کا سب سے بڑا سماجی واقعیت نگار ہے۔ پریم چند نے کسانوں پر ہونے والے ظلم، اُس کی کتھا اور اُن کے دُکھ درد کہانیوں کی صورت میں ہمارے سامنے لائے ہیں کہ ہمیں زمانے کا پستا ہوا سب سے بڑا شخص کسان ہی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ کسان جو ہمیشہ

جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں مگر سود اور بیاج کا پیسہ اُن سے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اگر پریم چند کی کسانوں سے متعلق کہانیاں پڑھی جائیں تو پریم چند کو کسانوں کا علمبردار کہنے میں ذرا بھی توقف نہیں گزرنا چاہیے۔

'کفن' کیا ایک گروہ، طبقہ یا فرد جب مسلسل استحصال پسندی کا شکار رہا ہو وہ معاشرے میں اپنی اہمیت اور معنویت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اُس کو اپنی عزت، آبرو اور شخصی وقار سے کیا لینا دینا؟ بلکہ استحصال پسندی بعض اوّقات اُسے سماج میں بے عزتی کروا کے ملتی ہے جس سے وہ سماج میں اپنی حیثیت کھو چکا ہوتا ہے اور وہ اپنی حیثیت کی تلافی کے لیے بے غیرتی پر بھی اُتر آتا ہے، سماج کی ترقی، تنزلی، پروان سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بہت محنت کرنے کے باوجود بھی جب اُسے سر چھپانے کے لیے جگہ نہ ملے، دو وقت کی روٹی نہ ملے، تن پر پہننے کے لیے کپڑے نہ ملیں اور وہ محنت سے بھی عاری آ جاتا ہے جیسا کہ اِس سے قبل افسانہ 'سوا سیر گیہوں' میں شنکر آ جاتا ہے۔ وہ سماج کی روایات سے منحرف ہو جاتا ہے۔ جب سماج اُسے نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ ایک ایسا پلید بن جاتا ہے جب اُسے سماج کی بے پرواہ نہیں رہتی۔

زمیندار رحم دل تھے، وہ گھیسو کی خصلتوں سے خوب واقف تھے مگر اِس کے سوا اور کوئی چارا نہیں تھا کہ اُسے پیسے دیتے۔ زمیندار نے روپے نکال کر پھینک دیئے اور منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ گھیسو ایک زمانہ شناس آدمی ہے جو بھیک مانگنا خوب جانتا ہے اور زمینداروں کے دلوں میں خوشامد کر کے پیسے بٹورنے کا فن خوب جانتا ہے وہ ایک ایسا فنکار ہے جو اپنے بیٹے مادھو کو کہتا ہے کہ یہی لوگ کفن کے پیسے دیں گے میں نے زندگی کے ساٹھ سال ایسے نہیں گزارے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں آہ و فریاد لے کر جاتا ہے۔ اُس کی آہ و بکا سنی جاتی ہے، مگر اپنے پیٹ کی آہ و بکا سب سے پہلی ہے جو کفن سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> "کیا گھیسو کی اِس استحصال زدہ نفسیات میں برسوں کی اس تشنگی کی جھلک موجود نہیں ہے جو موقع پاتے ہی اتنی توانا ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے زندگی کے دوسرے تقاضے اور سماج کے اندیشے ماند پڑ جاتے ہیں غریب کی زندگی میں یہ وقتی خود فراموشی بھی وہ تشنگی ہے جس کے چند لمحے حاصل کرنے کے لیے وہ زندگی کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔ یہ فن کی کیسی عظمت اور سماج پر کیسا بھرپور طنز ہے۔"(۱۰)

پریم چند نے گھیسو اور مادھو کے اِس استحصال زدگی میں کیسے کیسے راز کھولے ہیں اور اِن بے ضمیر اور مردہ لوگوں سے کیسے کیسے جملے کہلوائے ہیں جس کی توقع شاید پریم چند سے ہی کی جاسکتی ہے کہ گھیسو کہتا ہے کیسا برارواج ہے کہ جیتے جی تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے کا چیتھڑا نہ ملے اور مرتے ہوئے ایک نیا کفن چاہیے۔ ایک برجستہ جملے پریم چند ہی کہلوا سکتے ہیں جو اپنا رونا تو روتے مگر ساتھ ہی میں ایسا درس دے جاتے ہیں جس سے قاری سوچنے، سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی پریم چند کا خاصہ ہے۔

ایسے لوگوں پر نشہ کب اثر کرتا ہے؟ جو اپنی عزت و آبرو اور خود فراموشی میں کھو چکے ہوتے ہیں۔ گھیسو اور مادھو کی طرح نجانے کتنے ہی لوگ اِس معاشرے اور سماج کا حصہ ہیں جو اِس بھوک اور بیماری سے بلکتے ہیں ایسے سماج پر کیا کوئی نشہ اثر کرے گا؟ اپنے آخری ایام میں پریم چند کا فن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا وہ معاشرے اور سماج سے ایسی ایسی کہانیاں لیتے تھے جو سچی تھیں مگر لکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔

پریم چند ایک سماجی واقعیت نگار ہیں جو سماج، اُس کی نفسیات، کسان کی بھوک، راجپوت کی شان و شوکت، غریب کا استحصال اور امیرانہ لب ولہجہ اور معاشرے میں چلتی ہوئی کہانیوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں اور سماج ہی کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اِن کہانیوں سے کہیں نہ کہیں ضرور بدلاؤ آیا ہوگا اور ضرور اِس معاشرے میں استحکام ٹھہرے گا جو پریم چند کا خاصہ تھا۔

حوالہ جات

۱۔ پریم چند، سوزِ وطن، کانپور: زمانہ پریس، ۱۹۰۸ء، (مقدمہ)

۲۔ شِورانی دیوی، پریم چند گھر میں، مترجم: سیّد حسن منظر، نئی دہلی: انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۲۰۰۷ء، ص:۱۸۸

۳۔ محمد حسین وانی، ڈاکٹر، پریم چند کے افسانے اور دیہاتی زندگی: ایک مختصر جائزہ (مضمون)، مشمولہ: اُردو ریسرچ جرنل، دہلی انڈیا، شمارہ ۲۰، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص:۵۶

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، فیصل آباد: مثال پبلشرز امین پور بازار، ۲۰۱۰ء، ص:۲۲۲

۵۔ پریم چند، پریم پچیسی (حصہ دوم)، لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۱۸ء، ص:۴۷

۶۔ پریم چند، پریم بتیسی حصہ اوّل، (پندرہ افسانے)، کانپور: زمانہ پریس، دسمبر ۱۹۲۰ء، ص:۲۱

۷۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند تنقیدی و سماجی محاکمہ، دہلی: عفیف آفیسٹ پرنٹرز، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص:۷۸

۸۔ پریم چند، پریم چالیسی، لاہور: گیلانی الیکٹرک پریس، ۱۹۳۰ء: ص:۳۷۲

۹۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند تنقیدی و سماجی محاکمہ، ص:۱۰۱۔۱۰۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۷۵